© rasailojaraid.com

خلیل احمد حامدیؒ کی یاد میں

(۱)

قاضی حسین احمد

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات کے بعد یک گونہ تسلی تھی کہ ملک غلام علی صاحب کی صورت میں سید مرحوم کے علمی وارث موجود ہیں۔ ملک صاحب کے فراق کا غم تازہ ہی تھا کہ سید کے ایک اور فکری وارث، مولانا خلیل احمد حامدی صاحب وفات پا گئے۔ یہ تحریک کے لیے دوسرا بڑا صدمہ ہے۔ حامدی صاحب اپنی صحت کے اعتبار سے بھی اس قابل تھے کہ وہ مزید طویل عرصے تک جماعتی خدمات انجام دیتے رہتے، سولہ سولہ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے مسلسل کام کرنا اب بھی ان کا معمول تھا۔ مختلف اجتماعات میں وہ مسلسل نوٹس لیتے رہتے اور بعد میں انھیں ترتیب دے کر مفید تر بنا دیتے۔ لیکن قدر اللہ و ماشاء فعل۔

حامدی صاحب کی سب سے نمایاں خصوصیت جو ذہن میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ مرحوم نے ابتدائے عمر سے ہی اپنے ذہن کو اس بات پر یکسو کر لیا کہ انھیں زندگی میں اللہ کا کام کرنا ہے۔ پھر اس مقصد حیات کے لیے انھیں جو جو اور جس قدر مواقع نصیب ہوئے انھوں نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ انھیں نوجوانی میں معاون دفتر کی معمولی خدمت قبول کرنے میں بھی تامل نہ ہوا۔

ساٹھ کی دہائی میں پہلے مارشل لا کے دوران حامدی صاحب کو بیرون ملک دورے پر بھیجا گیا تو انھوں نے اس سفر کو اسلامی تحریکات سے روابط بڑھانے، جماعت کی دعوت اور حالات سے عالم کو متعارف کروانے اور اپنی عربی کی استعداد کو بڑھانے کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ ایک مرتبہ شام کے ایک مکتبہ کے مالک نے مجھے بتایا کہ حامدی صاحب اس دورے کے دوران میں تقریباً تین ماہ تک ہمارے پاس رہے، اور اس عرصے میں اپنی عربی کی استعداد کو بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔

ذہنی یکسوئی اور فکری ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلسل اور ان تھک محنت کو اپنا شعار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنائے رکھا۔ حامدی صاحب نے سید مودودی کی فکر کو پورے عالم عرب میں متعارف کروایا، عالم عرب کی اسلامی تحریکات سے اہل پاکستان کو متعارف کرایا، اور اس طرح انھوں نے پاکستان اور عالم اسلام کی تحریکوں اور شخصیات کو ایک دوسرے سے باہم مربوط کر دیا۔ اس ضمن میں مولانا حامدی نے عرب دنیا میں مولانا سید مسعود عالم ندوی اور ان کے بعد مولانا عاصم الحداد کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر ہمیشہ قائم رہنے والی ایسی شاندار عمارت تعمیر کر دی ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان اور عالمی اسلامی تحریکات اب یک جان ہو چکی ہیں۔

مولانا حامدی صاحب عرب ممالک میں تیس سال سے زیادہ عرصے تک کام کرتے ہوئے محنت شاقہ کے ذریعے، اسلامی تحریکوں، اسلامی شخصیات اور اسلامی ممالک کے متعلق اس قدر معلومات حاصل کر چکے تھے کہ وہ اب معلومات کا ایک وسیع انسائیکلوپیڈیا تھے۔ ۵۰ سال میں تیار ہونے والا ایک انسان آج اچانک ہم سے رخصت ہو گیا ہے، تو ایک بہت بڑا خلا نظر آ رہا ہے۔ اگرچہ اس بات میں شک نہیں کہ "ید اللّٰہ علی الجماعۃ، اللہ تعالیٰ اپنے دین کا کام کبھی رکنے نہیں دیتا، وہی افراد کو اٹھاتا اور ان سے کام لیتا ہے۔

افغانستان کے ایک رہنما مولانا جلال الدین حقانی کا ایک بہت قریبی اور قیمتی ساتھی شہید ہو گیا تو سب لوگ بے حد دلگیر اور افسردہ تھے کہ اب کیا ہوگا۔ مولانا حقانی کہنے لگے کہ دنیا میں بھی اگر کوئی بادشاہ اپنے کسی افسر کا تبادلہ کرتا ہے تو اس کا متبادل کوئی اور انتظام کرتا ہے تو جو پوری کائنات کا بادشاہ ہے وہ اپنے دین کے کام کے لیے کوئی متبادل انتظام نہیں کرے گا؟ اس پر یقین کے باوجود، مولانا حامدی صاحب کی صورت میں ۵۰ سال کا جمع شدہ معلومات و تعلقات کا خزانہ اٹھ جانے پر ہمارے دل افسردہ و ملول ہیں۔

مولانا حامدی صاحب مرحوم کا ایک اور عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے متعدد شاندار ادارے قائم کیے اور کامیابی سے چلائے۔ ان اداروں میں ایک اہم ادارہ سید مودودی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ ہے۔ جس طرح امت مسلمہ ہر رنگ اور ہر خوشبو کے پھولوں کا ایک حسین گلدستہ ہے، اسی طرح سید مودودی انسٹی ٹیوٹ بھی ہر رنگ، ہر زبان اور نسل کے تنوع سے تشکیل پانے والا ایک مربوط و مضبوط اور خوشنما گلدستہ ہے۔ ۱۹۷۹ میں قائم ہونے والے علمی و تحقیقی ادارے 'ادارۂ معارف اسلامی' نے بھی مولانا حامدی صاحب کی زیر نگرانی متعدد تحریکی و علمی کتب 'تالیف' تصنیف' ترجمہ اور طبع کرنے کا قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔

مولانا حامدی صاحب کے توسط سے پاکستان بھر میں متعدد مساجد، مدارس اور مراکز بھی قائم ہوئے ہیں۔ یہ تمام ادارے جماعت کے پاس ایک امانت ہیں۔ یہ صدقہ جاریہ ان شاء اللہ جاری رہے گا، او

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جماعت و بزرگان و کارکنان جماعت کے لیے خیر دارین کا موجب بنے گا۔

مولانا حامدی صاحب کی شخصیت کا ایک بنیادی وصف یہ تھا کہ وہ ایک پرامید داعی حق تھے۔ وہ نئی بھرت امید کی کرنیں جمع کرتے اور انھیں پاکستان میں لاکر بکھیر دیتے۔ ایک داعی دین کا حقیقی و لازمی وصف ہی یہ ہے کہ وہ مردہ دل' مایوس انسانوں کے دلوں میں امید کی جوت جگا دے' انھیں منزل کی جھلک دکھا کر تیز گام کر دے۔ ان کے دلوں میں کچھ نہ کچھ کر ڈالنے کی امنگ اور جذبہ پیدا کر دے۔ ان کے قلوب میں یہ یقین پیدا کر دے کہ دو قدم آگے بڑھو' منزل تمھارے انتظار میں ہے۔ بال کی کھال اتار کر مایوس کن تجزیے کرنے اور کارکنان میں مایوسی پھیلانے والے لوگ کبھی انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ انقلابی قائد و کارکنان وہی ہوتے ہیں جو امید کے ایک ٹمٹماتے چراغ کو بھی اپنی پناہ و حصار میں لے کر اس کی لو بڑھانے اور اس چراغ سے مزید چراغ جلانے میں لگے رہتے ہیں' تاکہ پھر ان چراغوں کو بجھانا کسی طوفان کے بس میں نہ رہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ اقبال بھی امید و یقین کی دولت سے مالا مال ہستیاں تھیں جنھوں نے مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں امیدوں کی نوید سنائی اور کہا کہ

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ایسی شخصیات سے ہماری صفوں کو کبھی خالی نہ ہونے دے یہاں تک کہ قافلہ حق اسلامی انقلاب کی منزل تک جا پہنچے۔

آخر میں ایک اور گواہی دیتا ہوں۔ مولانا حامدی صاحب نے بانی جماعت سید کے ساتھ' پھر محترم میاں طفیل محمد صاحب کے ساتھ بھی' ان کے پورے دور امارت میں' اپنی ذمہ داریاں بحسن و خوبی نبھائیں' اور میرا بھی عمر کے آخری لمحات تک ساتھ دیا اور اس طور دیا کہ عمر' تجربے' علم اور عمل میں مجھ سے آگے ہونے کے باوجود سمع و طاعت کا حق ادا کر دیا۔

(۲)

خرم مراد

ہمارا آٹھ روزہ فہم و تدریس قرآن کا کورس ہو رہا تھا۔ خلیل صاحب (رحمہ اللہ) اپنے دل نواز و دل نشیں و دل آفریں انداز میں شام کا لیکچر دے رہے تھے۔ انھوں نے شاگردوں کو (طبرانی کے حوالہ سے) ایک حدیث سنائی: ''جو یہ جاننا چاہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس کا مقام کیا ہے' وہ یہ دیکھے کہ اللہ کا مقام اس کے نزدیک کیا ہے''۔ شاگردوں پر کیا گزری پتہ نہیں' استاد کے دل میں ہلچل مچ گئی' اور اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ایک تراز و نصب ہو گئی۔ مفہوم نیا نہ تھا' الفاظ نئے ضرور تھے کہ یہ حدیث اس سے پہلے نہ سنی تھی مگر یہ تو 'از دل خیزد بر دل ریزد (دل سے بات نکلی ہے دل میں پیوست ہو گئی ہے)' والا معاملہ ہوا تھا۔

اللہ کی مرضی یہی تھی کہ فرشتہ موت خلیل صاحب کو اچانک ہمارے درمیان سے اٹھا کر اس کے پاس لے جائے جس کے پاس اپنا مقام بنانے کی تگ و دو میں وہ آخری وقت تک ہمہ دم و ہمہ تن لگے رہے۔ ۲۵ نومبر کو جمعہ کے دن جب فجر کے بعد ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو یہ خیال کیسے آسکتا تھا کہ اب کان ایک ایسے حادثہ پر جانکاہ کی خبر سننے والے ہیں جس کے نقصان کا پورا اندازہ کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ "بڑی افسوس ناک خبر ہے! مولانا خلیل احمد حامدی آج صبح انتقال فرما گئے ہیں"۔ شعبہ تنظیم کے ناظم' برادرم رشید کی رندھی ہوئی آواز کانوں میں پڑی۔ دل نے ماننے سے انکار کر دیا۔ کچھ انکار' کچھ حیرت' کچھ جھنجلاہٹ' اور کچھ امید کہ شاید یہ الفاظ واپس ہو جائیں' ملے جلے جذبات کے ساتھ میں نے کہا "نہیں بھئی' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! ایسا کیسے ہو سکتا ہے!"۔ "صبح قصور کے قریب ٹریفک کے حادثہ میں زخمی ہوئے اور ہسپتال میں فوت ہو گئے۔ ان کی اہلیہ اور بہو ہسپتال میں ہیں"۔ اب ماننے کے سوا کوئی چارا نہ تھا' امید کے سب تنکے ٹوٹ گئے' فراق کی مقدر گھڑی آچکی تھی' کسی خواہش' کسی جھاڑ پھونک سے اللہ کے فیصلہ کو ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے ہارے ہوئے دل کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔

اب تو ایک ہی چارا تھا اور وہ صبر۔ جو یقین صبر کا سرچشمہ ہے' وہ الفاظ کے قالب میں زبان پر جاری ہو گیا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ اللّٰھم آجرنا فی مصیبتنا، وعوضنا خیرا منھا، للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطٰی و کل شیء عندہ بمقدار میرے اللہ' ہماری مصیبت کا پورا اجر دے' ہمیں ان کا نعم البدل عطا کر' اللہ ہی کا تھا جو اس نے لے لیا اور دیا بھی اسی نے تھا' اور ہر چیز کے لیے اس کے پاس ایک پیمانہ مقرر ہے۔

میں خلیل صاحب اور ان کی زندگی کے بارے میں بہت کم جانتا ہوں۔ میرا کبھی ان سے سفر حضر میں طویل ساتھ نہ رہا' نہ میں نے ان کے ساتھ کوئی معاملہ کیا' میری ان کے ساتھ تنہائی میں مجلسیں نہیں رہیں' بلکہ اب جبکہ وہ چلے گئے ہیں تو مجھے اپنی اس حرمان نصیبی کا احساس شدت سے ستا رہا ہے کہ میرا تعلق تو ان سے بس واجبی سا تھا۔ یہ ان کی فیاضی' محبت اور لطف و عنایت کا کمال تھا کہ میں اس زعم میں مگن رہا کہ میں ان سے بہت قریب ہوں۔ جو لوگ ان کے بارہ میں کچھ لکھنے کے واقعی اہل ہیں' ان میں میرا نام سب سے آخر میں آئے گا۔ لیکن مشک آہو کا قرب ایک لمحہ کو بھی نصیب ہو جائے' اس سے مس بھی ہو جائے' تو اس کی خوشبو مشام جان کو ہمیشہ کے لیے معطر کیے رہتی ہے۔ کچھ ان کی خوشبو کی مہک' کچھ ان ہی کا پیدا کیا ہوا ان سے قرب کا زعم' بس اسی لیے ان کو یاد کرنے کے لیے بیٹھ گیا ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ خلیل صاحب اپنے رب کے ایک خطاکار و گناہگار بندے تھے، جیسے سب انسان ہوتے ہیں، اور ان کو ہونا چاہیے۔ کُلُّکُمْ مُذْنِبٌ۔ وہ ایک ضعیف و کمزور انسان تھے، جیسے سب انسان ہوتے ہیں اور ان کو ہونا چاہیے، خُلِقَ الانسان ضعیفاً۔ اور مجھے بہت کچھ زیادہ نہیں معلوم، مگر میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے رب کے، اس کے کام کے، ایک وفادار بندے تھے، اور ایسے بہت کم انسان ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خوئے وفاداری میں اتنے یکسو اور عہد وفا نباہنے میں اتنے منہمک رہتے تھے کہ وفادار بندوں میں بھی ایسے وفادار بس بہت ہی قلیل بلکہ نایاب ہوتے ہیں۔ وفاداری بشرط استواری ہی اصل ایمان ہے، یہ راز خلیل صاحب اچھی طرح پاگئے تھے۔ اللہ کے پاس اپنا مقام بنانے کے لیے انھوں نے اسی وفاداری کو اپنا وسیلہ بنایا، اس کو اپنے دل سے لگا کر رکھا، اسی کو نباہنے میں اپنی ساری تگ و دو لگا دی۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو جماعت اسلامی کے دستور کے اس مطالبہ کی تعبیر بنا لیا تھا: زندگی کی حقیقی ضرورتوں کے سوا ان تمام دوسری مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں۔

یہی ان کی قوت کا سرچشمہ تھا، یہی ان کی عظمت کا راز ہے، اسی کے بل پر وہ اپنی مختصری زندگی میں اتنے ڈھیر سارے کام کر گئے جن کا تصور بھی میرے جیسے ضعیف آدمی کے لیے ہمت شکن ہے۔ یہی فقیری میں ان کی کل متاع تھی، اسی متاع سے وہ فقیری میں امیر تھے۔

پھر ہم کیوں امید نہ رکھیں کہ خلیل صاحب کا مقام اللہ کے ہاں وہی ہوگا جو ان کے ہاں اللہ کا اور اس کے کام کا تھا۔ وہ اس کے وفادار تھے، وہ ان سے عہد وفا کرے گا۔ انھوں نے اس کے کام کو اپنے دل سے لگا کر رکھا تھا اور جی جان سے کرتے تھے، وہ انھیں اپنے جی میں یاد رکھے گا۔ وہ دنیا کے طول و عرض میں اس کے پیغام کا چرچا کرتے پھرتے تھے، وہ اس دنیا میں، جس میں سارے آسمان اور زمینیں سما جاتیں، یہاں کی مجلسوں سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور پاکیزہ مجلسوں میں ان کا چرچا کرے گا۔ (کما قال اللہ تعالیٰ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او کما قال)

یہ ۱۹۴۳ کا سال تھا جب خلیل صاحب نے سفر وفا کے لیے قدم آگے بڑھائے۔ اس وقت وہ ۱۴ سال کے تھے، کہ ان کی یادداشت کے مطابق وہ ۲۳ جون ۱۹۲۹ کو ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں حامد میں پیدا ہوئے تھے۔ تاریخ کے اس لمحہ سید مودودی نے دعوت وفا کی جو پکار بلند کی تھی، فیروز پور شہر میں مولوی محمد علی (م ۱۹۸۱، لاہور) اس کے اولین نقیبوں میں تھے، اور انھوں نے ہی خلیل صاحب کو اس کے ذائقہ سے روشناس کیا۔ لیکن یہ بیج جس زمین میں پڑا تھا وہ اسی کے لیے تیار کی جا رہی تھی۔

ان کا خمیر ان کے والد، مولانا فتح محمد صاحب کے علم و زہد سے گوندھا گیا تھا۔ بچپن ہی سے رات کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب بھی میری آنکھ کھلتی' میں انھیں مصلیٰ پر پاتا"۔ ان کے گھر کی فضا قال اللہ اور قال الرسول ؐ کی صداؤں سے گونجتی' اور ان کے ہر طرف دینی کتب کے ڈھیر تھے۔ (یہ انتہائی قیمتی ذخیرہ انھیں بصد حسرت ویاس اپنے گاؤں میں ہی چھوڑنا پڑا' جب وہ ۱۹۴۷ میں پاکستان آئے)۔ راہ وفا سے روشناس ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے سینہ کو کلام الٰہی کا مسکن بنا چکے تھے۔ بچپن کی اس تعلیم کے نقوش ان کے نماز کے اہتمام' صف اول میں امام کے عین پیچھے موجودگی' ذکر و فکر میں اشتغال' سفر و حضر میں شش عید کے روزوں کے التزام میں ہر وہ شخص دیکھ لیتا جو ان کے ساتھ ہوتا۔

ایسی زرخیز زمین میں دعوت وفا کا بیج پڑا' تو اس کے برگ و بار لانے میں کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی۔ ۱۹۴۳ میں خلیل صاحب دارالاسلام پٹھانکوٹ گئے اور سید مودودی سے ملے۔ ۱۹۴۵ میں پہلے کل ہند اجتماع میں شرکت کے لیے پھر وہاں گئے' اور اپریل ۱۹۴۶ میں الہ آباد میں دوسرے کل ہند اجتماع میں بھی شریک ہوئے۔ ۱۹۴۹ میں وہ جماعت کے رکن بن گئے' لیکن ایک سال پہلے ہی جماعت اسلامی لاہور کے دفتر میں معاون کی ذمہ داری قبول کر کے خلیل صاحب ان فقرا کی صف میں شامل ہو چکے تھے جن کی تعریف قرآن نے یوں بیان کی ہے کہ الذین احصروا فی سبیل اللہ (جو اللہ کی راہ میں روک لیے گئے ہیں)۔ اس کے بعد اس صف سے ان کا رشتہ ایسا قائم ہوا کہ اسی وقت ٹوٹا جب انھوں نے قصور کے ہسپتال میں جان' جان آفریں کے سپرد کی۔ وہ اس مقام فقر کے رموز سے خوب آشنا تھے۔ ان کی زبان پر کبھی یہ نہ آیا کہ میں نے تو تحریک کے لیے یہ اور یہ کیا' نہ انھوں نے اس کے عوض خصوصی حقوق کا مطالبہ کیا' نہ زندگی بھر انھوں نے کبھی جماعت سے معاوضہ کی کمی کی شکایت یا اضافہ کی درخواست کی۔ ان کے بیٹے سہیل بتاتے ہیں: "اباجان کو ۲۵۰۰ ملتے تھے' سید مودودی نے طلب کیا تو ۵۰۰ پر حاضر ہو گئے۔ لوگوں نے اس حماقت سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ ان کا ایک ہی جواب تھا: میرے مرشد نے بلایا ہے"۔

اس عرصہ میں خلیل صاحب نے اور بہت سی وابستگیاں قائم کیں۔ ۱۹۵۵ میں عاصم الحداد صاحب کے ساتھ دارالعروبہ سے وابستہ ہوئے' پھر آخر دم تک وابستہ رہے۔ دسمبر ۱۹۶۰ میں پہلی مرتبہ سید مودودی کے ساتھ سعودی عرب گئے' پھر ان کے ساتھ ایسے چمٹ گئے کہ ممکن نہ تھا کہ وہ بیرون ملک جائیں اور خلیل صاحب ہمراہ نہ ہوں۔ آہستہ آہستہ سارا عالم ان کی منزل بن گیا۔ ہمیں تو اگلے شہر جانا بھی دشوار ہو جاتا ہے وہ ہر وقت پابہ رکاب رہتے۔ فسیحوا فی الارض کی تفسیر بن گئے تھے۔ دعوت الی اللہ کی دھن میں وہ کہاں کہاں نہیں پہنچے: شمالی امریکہ سے ملایشیا تک' سرائیوو اور البانیہ میں' جہاں ضرورت ہوتی وہ موجود ہوتے۔ چند دن پہلے ایک اندرونی قضیہ نپٹانے سری لنکا پہنچ گئے۔ واپسی میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مالدیپ میں رکے اور تھائی لینڈ کی ہوا بھی کھائی۔ بڑے مزے لے لے کر کہانی سنا رہے تھے۔ ان کے سفرنامے بڑے پرکشش ہوتے تھے۔ سادہ اور سلیس زبان، تحقیقی معلومات سے پر، جزئیات و تفصیلات تک درج، غضب کی قوت مشاہدہ اور قوت حافظہ کے مرقعے، دعوت الی اللہ کی خوشبو میں رچے بسے، ہر لفظ میں امیدوں کے چراغ روشن، اور دلچسپ اتنے کہ ختم کرنے سے پہلے ہاتھ سے رکھنے کو دل نہ چاہے۔ پتہ نہیں کب کون ان کے سفرناموں کو پرکھ کر ان کی قدر و قیمت سے دنیا کو آشنا کرے گا۔

کثیر العیال ہونے کے باوجود کثیر السفر تھے اور کثیر السفر ہونے کے ساتھ کثیر المقاصد تھے، نتیجہ خیز مقاصد۔ خلیل صاحب کو ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کی دھن لگی رہتی تھی، وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ ان کے ڈھیر سارے کاموں کی مکمل فہرست بنانا ممکن نہیں۔ دار العروبہ، علمی و تحقیقی کام کے لیے ادارہ معارف اسلامی، اشاعت کتب کے لیے مکتبہ امنار، بین الاقوامی طلبہ کو داعی اور مجاہد بنانے کے لیے سید مودودی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ، بچوں بچیوں کی تعلیم کے لیے منصورہ اور کھڈیاں میں اسکول، تعمیر مساجد پروجیکٹ، حلقات قرآنی پروجیکٹ، امدادِ یتامیٰ پروجیکٹ، اور نامعلوم کتنے پروجیکٹ۔ جماعت کے بیرونی تعلقات میں تو ان کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی تھی۔

جتنی اچھی عربی لکھتے بولتے تھے وہ کسی خراج تحسین کی محتاج نہیں، لیکن بالآخر انھوں نے ذاتی محنت سے انگریزی میں بھی اتنی استعداد پیدا کر لی تھی کہ بین الاقوامی مجلسوں میں شریک ہوتے، سب کی بات سمجھتے، بس اپنا مدعا عربی میں پیش کرتے۔ زبان سے زیادہ، ان کو جو قدرت تجزیہ و ترتیب اور اختصار بیان پر حاصل تھی، وہ حیرت انگیز تھی۔ برجستہ بولتے، جھٹ سے نکات مرتب کر لیتے اور خوب بولتے، مرشد کی صحبت کی وجہ سے جمال ہم نشین ان کی تحریر و تقریر میں عیاں ہیں۔ انتقال سے پہلے آخری سفر امیر جماعت کی ہمرکابی میں ایران کا ہوا۔ قاضی صاحب بتاتے ہیں کہ ایک مجلس میں، جہاں بہت سے علماء و اکابر جمع تھے، انھوں نے خلیل صاحب کو وفد کا ترجمان بنا دیا۔ چند منٹ میں انھوں نے سارے نکات ترتیب دے کر، ایک مشکل صورت حال میں، اپنی ساری بات بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کر دی۔ مجھے سفر ایران کی روداد سنانے کا وعدہ کیا تھا، مگر انھیں جانے کی اتنی جلدی تھی کہ وقت ہی نہ ملا۔

علمی و فقہی مسائل ہوں یا تحریکی معاملات، ان کی نظر وسیع تھی، ذہن وسیع تھا، اطراف و جوانب پر نگاہ رکھتے، جدید دور کے تقاضوں کو سمجھتے، حالات کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھتے، کسی سے سیکھنے میں بھی کوئی عار نہ تھا۔ وقت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تحریک کی حکمت عملی میں تبدیلی کے شدت سے قائل تھے۔ سیاحت کی وجہ سے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھے، وسیع الذہنی میں کچھ دخل اس سیاحت کو تھا اور کچھ اس کو بھی کہ انھوں نے اپنی دینی تعلیم کسی ایک مکتب فکر سے بندھ کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل نہیں کی تھی۔ وہ ندوۃ العلما اور مظاہر العلوم کی تابع جامعہ عظمتیہ کرنال بھی گئے تھے اور مولانا عبدالحلیم قاسمی اور مولانا عبدالعلیم قاسمی (مرحومین) کے ٹمپل روڈ پر واقع مدرسہ عربیہ بھی۔

وہ وسیع الحلم اور وسیع الذہن ہی نہ تھے، وسیع القلب اور وسیع الظرف بھی تھے۔ آدمی کچھ نہ کرے تو ایک ہی عیب شمار ہوتا ہے، کچھ کرنے لگے تو سو کیڑے نکل آتے ہیں، کچھ صحیح کچھ غلط۔ خلیل صاحب بھی اس سے محفوظ نہ تھے، اس لیے کہ وہ بہت سے کام کر رہے تھے اور بہت سے ادارے چلا رہے تھے۔ کئی دفعہ ان معاملات کا ذکر آیا، نکتہ چینوں کا ذکر بھی آیا، میں گواہی دے سکتا ہوں کہ میں نے کبھی خلیل صاحب کے منہ سے کسی نکتہ چیں کی شکایت نہیں سنی، برائی نہیں سنی۔ جب بھی ذکر ہوا، اچھی طرح یاد کیا، اور جو ان کے لیے کر سکتے ہوں وہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ تعریف کرنے میں کسی بخل سے کام نہ لیتے، بلکہ بڑے فیاض تھے۔ میرے تربیتی کورس ہوتے، سب سے بڑھ کر وہ تعریف کرتے اور اپنے تاثرات کا اظہار کرتے۔ بیرونی سفر سے واپس آتے، وہاں کے لوگوں کے تاثر کے حوالے سے ترجمان القرآن کی تعریفوں کے ایسے پل باندھتے کہ مجھے سخت شرمندگی ہونے لگتی۔

اسی روشن خیالی اور روشن دلی کی وجہ سے ان کے سینہ میں ہمیشہ امید کا چراغ روشن رہتا۔ تحریر ہو، تقریر ہو، مشورہ ہو، مجلس ہو، وہ امید سے لبریز رہتے، مایوسی ان کے پاس بھی نہ پھٹکتی۔ محترم قاضی صاحب نے ان کی یہ خوبصورتی بڑے خوبصورت الفاظ میں بیان کی: "خلیل صاحب دنیا بھر سے امید کی کرنیں اپنے دامن میں بھر بھر کر لاتے اور وہ یہاں بکھیر دیتے"۔

ایک دفعہ ایک قضیہ میں مجھے ثالث بنایا گیا۔ اس سلسلہ میں مجھے خلیل صاحب سے بھی کچھ استفسار کرنا پڑا۔ میں نے ان سے کہہ بھی دیا کہ اسلامی اصولوں کے مطابق، آپ کی طرف سے انکار کافی ہے، بار ثبوت مدعی کے ذمہ ہے۔ مگر وہ کھل گئے۔ اپنی کثیرالعیالی کا بتایا، اپنا رہن سہن دکھایا، اپنے اثاثوں کا ذکر کیا۔ یہ سب سن کر میری شرمندگی اور بڑھ گئی کہ آخر میں نے یہ سوال ان سے کیوں کیا۔

انھوں نے اپنے اعمال ہی سے نہیں، اپنی اولاد سے بھی اس کا پورا اہتمام کیا کہ حضور ؐ اپنی امت پر فخر کر سکیں۔ ان کے نو بیٹے ہیں: سہیل، عذیر، زید، انس، اسامہ، معاذ، معوذ، ہشام اور محسن۔ انس اپنے باپ اور دادا کی طرح حافظ قرآن ہیں، اور معاذ اور معوذ ۱۸ اور ۲ پارے حفظ کر چکے ہیں۔ پانچ بیٹیاں ہیں: میمونہ، نصیبہ، انیسہ، معاذہ اور شیما۔ دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی شادیوں سے وہ فارغ ہو چکے تھے۔ جس دن ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا، ۳ دن کے بعد زید کی شادی ہونے والی تھی، جو اب بخیر و خوبی انجام پا چکی ہے۔ ان کی اہلیہ ایک نیک خاتون ہیں، جو انتہائی ناساعد حالات کے باوجود، بچوں کی پرورش بھی کرتی رہیں، شوہر کی ہمدم و ہمساز بھی رہیں۔

© rasailojaraid.com